شریعت، طریقت اور اجتماعیت پر مبنی دینی شعور کا نقیب

ماہنامہ

رحیمیہ

لاہور

زیر سرپرستی: حضرت اقدس مولانا **شاہ سعید احمد** رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ مسند نشین سلسلہ عالیہ رحیمیہ رائے پور

اپریل 2010ء / ربیع الاول، ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ رجسٹرڈ نمبر R-123 جلد نمبر 2 ، شمارہ نمبر 4 ☆ قیمت فی شمارہ : مبلغ 10 روپے ☆ سالانہ ممبرشپ : مبلغ 150 روپے

مجلس ادارت

صدر مجلس: ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن

مدیر اعلیٰ : مفتی عبدالخالق آزاد

مدیر: محمد عباس شاد

ترتیب عنوانات

درسِ قرآن.....حضرت مولانا خواجہ عبدالحئی فاروقیؒ 2

درسِ حدیث.....ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن 2

اداریہ.....مدیر اعلیٰ 3

مطالعہ سیرت کے عملی تقاضے..... ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن 3

خطبہ جمعۃ المبارک.....مفتی عبدالخالق آزاد 4

سیرت النبی ﷺ کا انقلابی کردار...سید نفیس مبارک ہمدانی 6

رفتارِ کار.....عتیق الرحمٰن ایڈووکیٹ 7

خطاب حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ 8

دینی مسائل.....مفتی عبدالغنی قاسمی 8

مجلس مشاورت

حضرت مولانا مفتی عبدالمتین نعمانی	(بورے والا)
حضرت مولانا مفتی عبدالقدیر	(چشتیاں)
حضرت مولانا مفتی عبدالغنی قاسمی	(لاہور)
حضرت مولانا محمد مختار حسن	(نوشہرہ)
حضرت مولانا پروفیسر حسین احمد علوی	(چشتیاں)
حضرت مولانا صاحبزادہ رشید احمد	(ڈیرہ اسماعیل خاں)
محترم محمد اسلوب قریشی	(لاہور)
محترم سید مطلوب علی زیدی	(لاہور)
حضرت مولانا مفتی محمد اشرف عاطف	(سعودی عرب)
محترم سید اصغر علی شاہ بخاری	(پیر جو گوٹھ)
محترم ڈاکٹر لیاقت علی شاہ معصومی	(سکھر)
محترم سید سیف الاسلام خالد	(راولپنڈی)
محترم ڈاکٹر عبدالرحمٰن راؤ	(سرگودھا)
محترم انجینئر آفتاب احمد عباسی	(کراچی)
حضرت مولانا قاری تاج افسر	(اسلام آباد)
حضرت مولانا ناصر عبدالعزیز	(جھنگ)
حضرت مولانا قاضی محمد یوسف	(حسن ابدال)
حضرت مولانا عبداللہ عابد سندھی	(شکارپور)

خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور کے دوسرے مسند نشین

حضرت اقدس مولانا **شاہ عبدالقادر** رائے پوری قدس سرہ

نے ارشاد فرمایا

"اگر ایسی جمہوری حکومت قائم کی جائے جو مساوات اِن معنوں میں قائم کرنے کے اصولوں پر کام کرے کہ:

- سب لوگوں کو حسبِ استعداد کچھ کام کرنا پڑے۔
- سب خوش حال زندگی بسر کریں۔
- ضروریاتِ زندگی میں تنگ نہ رہیں۔
- اچھا کھانا، اچھا پہننا اور گرمی سردی سے بچاؤ کا موزوں اور صاف مکان۔
- مفت اعلیٰ طبی امداد۔
- عزت کی پُرامن اور راحت بخش زندگی میسر ہو۔

تو اس کو دین کے خلاف قرار دینا اور مذہب کو ایسی کوششوں میں آڑ بنانا، مذہب کو برباد کرنا ہے۔ اور لوگوں کو مذہب سے برگشتہ کرنے کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے؟"

(مجلس: ۲۸ محرم الحرام ۱۳۶۶ھ، مطابق 23 دسمبر 1946ء بمقام: ڈھڈیاں، سرگودھا)

(ارشادات از حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ، ص 154، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، 25 لوئر مال، لاہور)

سالانہ ممبرشپ کی رقم "ناظم دفتر" کے نام ارسال کریں، اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھ کر بھیجیں۔

پرچہ ہر ماہ کی 3 اور 4 تاریخ کو پوسٹ کر دیا جاتا ہے۔

شعبہ مطبوعات **ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور**

برائے رابطہ : رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

فون: 0092-42-36307714/36369089

Web:www.rahimia.org

☆ **رحیمیہ** کا انگلش ایڈیشن ہماری ویب سائٹ پر پڑھا جا سکتا ہے۔

www.rahimia.org

سرمایہ پرستی کے بھیانک نتائج

تشریح: حضرت مولانا خواجہ عبدالحئی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۝ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ۝ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ (القرآن۔۹۰:۵تا۱۰)

’’کیا وہ خیال رکھتا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہ پائے گا۔ کہتا ہے کہ میں نے بہت سا مال برباد کر دیا۔ کیا اسے یہ گمان ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں۔ بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں۔ اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے۔ یہ چیزیں بھی دیں اور اس کو خیر و شر کے دونوں راستے بھی دکھا دیے‘‘۔

لُبَدًا جمع ہے لُبْدَۃٌ کی۔ اس کے لغوی معنی ایک کو دوسرے پر رکھنے کے ہیں۔ مگر اب اس سے مراد مال کی کثرت ہے۔ نَجَدٌ اونچے مقام کو کہتے ہیں۔ ملک نجد کو اسی لیے نجد کہتے ہیں کہ وہ تہامہ کے مقابلے میں بلند جگہ پر واقع ہے۔ ان آیات میں نجدین سے مراد خیر و شر کے دونوں راستے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ دہر میں آتا ہے: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (۷۶:۳) ’’ہم نے اسے رستہ بھی دکھا دیا۔ اب وہ خواہ شکر گزار ہو، خواہ ناشکرا‘‘۔

ایک شخص روزِ ولادت سے وفات تک تکلیف میں مبتلا ہے، مگر اس کے جہل و نادانی کی یہ حالت ہے کہ فریب دہ آرام اور باطل راحت کے حصول میں اپنی قوت و طاقت صرف کر دیتا ہے۔ کیا وہ اس خیال میں ہے کہ جس فاطر السماوات والارض (آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے والے) نے یہ قانون بنایا ہے۔ وہ اسے یوں ہی آزاد چھوڑ دے گا۔

وہ دولت جمع کرتا ہے۔ تمام عمر اُس کے کسب و حصول میں صرف کر دیتا ہے۔ اور دولت کے حصول کے لیے حلال و حرام کی تمیز نہیں رکھتا۔ یہ سرمایہ پرستی کے مرض میں مبتلا ہے۔ محنت مزدوری کرنے والوں کے حقوق پر ڈاکا ڈال کر دولت کماتا ہے۔ پھر اس کو بے جا مواقع میں خرچ کرتا ہے۔ ناچ اور رنگ کی صحبتیں منعقد ہوتی ہیں۔ پھر دولت کی بنیاد پر جاہ پرستی کے مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور عہدوں کے حصول کے پیچھے بھاگتا ہے۔ خواہ اس کے نتیجے میں انسانیت کو غلام ہی کیوں نہ بنانا پڑے۔ اس کی سرمایہ پرستی اور جاہ پرستی کا عالم یہ ہے کہ اسلامی حکومتوں کے برباد کرنے، سرکاری خطابات حاصل کرنے، اور درباروں میں کرسی نشینی کے عشق میں وہ سامراجی حکومتوں کو چندے دیتا ہے۔ اور ملک پر غلامی مسلط کرنے والوں کا حاشیہ نشین بن جاتا ہے۔ اور یہ گمان کرتا ہے کہ اب اس تگ و دو کے بعد خطاب یافتہ ہو جانے اور حاکم اعلیٰ کی صحبت و ہم نشینی پر مجھے حقیقی راحت مل جائے گی۔ پھر اس تمام بداخلاقی اور فسق و فجور کی زندگی کے بعد بھی اسے یاس و حرماں اور ناکامی و نامرادی کے سوا اور کچھ نہیں حاصل ہوتا تو پکار اُٹھتا ہے کہ میں نے تو اپنی تمام دولت یوں ہی برباد کر دی، اور کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ سامراجی حکومتیں اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر کے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتی ہیں۔ حال آں کہ وہ اپنی دولت ان کے مقاصد کے لیے استعمال کر چکا ہوتا ہے۔ اب اس کے لیے سوائے مایوسی اور نا اُمیدی کے اور کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا۔

بھلا کیا ایک غیر مرئی ہستی اس کی ان تمام حرکات کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ کس طرح اس بداخلاق کو نتائج صالحہ سے شرف اندوز کر سکتی تھی۔ جب کہ اس کا ہر قدم جو اُٹھتا تھا تو اس میں فرزندانِ اسلام اور مظلوموں ہی کی تباہی و بربادی مضمر ہوتی تھی۔ اگر وہ اپنی جہالت و لاعلمی کا عذر کرے تو یہ مسموع نہیں۔ اس لیے قانون سے ناواقفیت کسی عقل مند کے نزدیک قابل پذیرائی نہیں۔ آخر آنکھیں کس لیے تھیں؟ اور اگر اندھا تھا تو خدا نے زبان اور دو ہونٹ نوازش کیے تھے۔ کسی سے پوچھ لیتا۔ پھر نیکی اور بدی کی راہیں اس کے سامنے کشادہ تھیں۔ ہدایت اور گمراہی میں واضح فرق کر دیا گیا تھا۔ سعادت و شقاوت میں کسی قسم کا اشتباہ و التباس نہ رہا تھا۔ دونوں میں حدِ فاصل قائم تھی۔ تم نے جو راہ اختیار کی۔ وہ اپنی پسند و اختیار سے کی۔ اب یہ عذر رائگاں کیسا؟

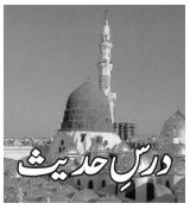

دین اسلام کی بھلائی کے پہلو

تشریح: ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن صاحب

عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ان رجلاً سأل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایّ الاسلام خیر؟ قال: تطعم الطعام، تقرأ السلام علی من عرفت و من لم تعرف. (رواہ البخاری)

ترجمہ: ’’عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، ایک شخص نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اسلام کی کون سی خصلت بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا: (ہر ایک کو) کھانا کھلانا۔ سلام کرنا اس کو پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو‘‘۔

حدیث میں پہلی خصلت یہ بتائی گئی ہے کہ فارغ البال افراد کھانے پینے کے معاملے میں اپنے ضرورت مند بھائیوں کی خبر گیری کریں، لیکن واضح رہے کہ کسی محتاج کو چند لقمے دے کر اس کا پیٹ بھر دینا، خبر گیری میں داخل نہیں ہے۔ ایک آدمی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سوالی بن کر آیا۔ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے گھر کچھ ہے؟ اس نے کہا ایک کمبل اور پیالہ ہے۔ آپ نے اس سے وہ منگوا کر فروخت کیا اور اس کی رقم سے کلہاڑی اور رسی منگوا کر اس آدمی کو لکڑیاں بیچ کر خود کمانا سکھایا۔ یہ ہے اصل میں ضرورت مندوں کی خبر گیری کرنا۔ آج کل ہماری سوسائٹی میں جس ذلیل طریقے سے ضرورت مندوں کو روٹی کا ٹکڑا دیا جاتا ہے۔ یہ ان کو تباہ کرنے کا بدترین ذریعہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ضرورت مندوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایسا نظام قائم کیا جائے جو ہر طرح سے ان کی خبر گیری کرے۔ اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بہترین حکمتِ عملی تیار کرے۔ اس تناظر میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ضرورت مندوں کی خبر گیری کے لیے جا بجا منظم ادارے ہوں۔ ایسا نظام قائم کیا جائے کہ جہاں ضرورت مندوں کی جسمانی ضروریات اس طرح پوری کی جائیں کہ ان کی انسانیت کو صدمہ نہ پہنچے۔ اور جو لوگ کام کر سکتے ہوں، ان کے لیے کام کے مواقع پیدا کیے جائیں۔ اور ایسا طریقۂ کار بہم پہنچایا جائے کہ ان کی تمام ضروریات پوری ہوں۔ یا ضرورت ہو تو ان کو آلاتِ کار مہیا کیے جائیں۔

اسلام خوش حال لوگوں کو اپنی کمائی میں سے ایک حصہ ضرورت مند افراد کے لیے ان کے حق کے طور پر اس لیے نکالنے کا حکم دیتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے فرد انسانی کی ساخت کچھ ایسی رکھی ہے کہ وہ معاشرے میں ہی آگے بڑھ سکتا ہے۔ انفرادی زندگی میں اسے اپنی پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے کا موقع نہیں ملتا اور وہ منجمد ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس کا اثر انسانی سوسائٹی کے دیگر افراد پر بھی پڑتا ہے۔ اس لیے معاشرے کو مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے افراد کی خبر گیری کا اجتماعی نظام قائم کرنا ضروری ہے۔ بصورت دیگر اسے معاشرہ، سوسائٹی اور اجتماع کہنا ہی ظلم ہے۔

حدیث میں دوسری خصلت سلام کو عام کرنے کی بیان کی گئی ہے۔ سلام کرنا درحقیقت ایک تحفہ ہے۔ جس میں مخاطب کو دنیا میں اس کی سلامتی کے لیے دعا بھی ہے اور ابدی سلامتی کی بشارت بھی دی جاتی ہے۔ نیز اپنی خیر خواہی سے اُسے مطمئن کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس میں اُبدی بشارت کے پہلو کے سبب اکثر فقہا کافر کو سلام کرنے میں پہل سے منع کرتے ہیں۔ جواب کی صورت میں بھی مخاطب کو غلط طور پر بشارت دینے کے الفاظ استعمال کرنے سے روکتے ہیں۔ لیکن اگر مقصد اس کی دنیوی سلامتی اور امن کے لیے دعا ہو اور اُسے اپنی جانب سے معاشرتی اطمینان دلانا ہو۔ تاکہ وہ اسلامی معاشرے سے اپنائیت محسوس کر کے اسلام سے قریب ہو تو اس حوالے سے پوری گنجائش موجود ہے۔

سلام کرنے میں یہ پہلو بھی شامل ہے کہ مسلمان امن اور سلامتی کا علم بردار ہوتا ہے۔ وہ دنیا میں انسانوں کے لیے سلامتی اور امن کا پیغام دینا چاہتا ہے۔ لوگوں کو مسلمانوں کے ساتھ اکٹھے رہنے میں کسی قسم کی گھبراہٹ اور بدامنی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

www.ahnafmedia.com

اداریہ

اقوامِ عالم کے تقاضے اور ''اقوامِ متحدہ'' کا کردار

ہر سال ستمبر کے مہینے میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوتا ہے۔ اور ملکوں کے سربراہان اور بین الاقوامی رہنمایان بڑے اہتمام سے اس میں شرکت کرتے ہیں۔ اور دنیائے عالم کو پیش آمدہ مسائل پر گفتگو کرتے اور خطابات جاری فرماتے ہیں۔

اس دفعہ اقوام متحدہ کے اجلاس کے موقع پر لیبیا کے سربراہ جناب معمر قذافی نے اپنے سب سے پہلے خطاب میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی تشکیل پر بجا طور پر سوالات اُٹھائے ہیں۔ اور اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ جب اقوام متحدہ کا چارٹر منظور ہوا تھا۔ تو اس وقت ممالک کے درمیان برابری کی بنیاد پر بین الاقوامی معاملات طے کرنے کا اصول تسلیم کیا گیا تھا۔ لیکن جب اقوام متحدہ کے دستور اور قواعد وضوابط کی تشکیل کی گئی تو چند ممالک کی سلامتی کونسل بنا کر امتیازی سلوک اختیار کیا گیا۔ اور پھر اس میں بھی مخصوص ممالک کو ویٹو پاور دے کر ناانصافی کی گئی۔ اور پھر ان ممالک کو ویٹو کے اختیارات دینے کے سلسلے میں بھی صرف چین ایک ایسا ملک ہے، جسے جمہوری انداز میں سلامتی کونسل کا ممبر بنایا گیا۔ باقی چاروں ممالک کو جمہوری بنیادوں پر سلامتی کونسل کا ممبر نہیں بنایا گیا۔ اپنی تقریر کے دوران انھوں نے اقوام متحدہ کا چارٹر پھاڑ کر پھینک دیا۔

اس موقع پر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ دنیا کے تقریباً تمام ممالک پر مشتمل یہ بین الاقوامی ادارہ ''اقوام متحدہ'' کیا واقعی ان مقاصد واہداف کو حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے، جس کے پیش نظر یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ اور جن بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ اس کی تشکیل کی گئی تھی۔ یہ حقیقت شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ تمام اقوام عالم کو امن چاہیے۔ خوش حالی چاہیے۔ انسانوں کے مابین پیار ومحبت اور رواداری کی ضرورت ہے۔ گویا انسان دوستی، امن وتحفظ اور معاشی خوش حالی وہ بنیادی اقدار ہیں، جو بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب، ملک وملت، تمام انسانوں کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن ان اقدار کے حصول کا صحیح طریقۂ کار کیا ہونا چاہیے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ کیا اس کا طریقہ یہ ہے کہ ممالک کے درمیان طبقاتی امتیاز کی دیواریں کھڑی کی جائیں؟ کیا اس کا طریقہ یہ ہے کہ عالمی سطح پر چند ممالک پر مشتمل ایسی سلامتی کونسل ہو جو بالادست ملکوں کے مفادات کی محافظ ہو اور کم زور ملکوں اور قوموں کو حقوق دلانے سے قاصر ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت اور مساوات کے نعرے لگانے والے ممالک کو اپنے کردار کے بارے میں جائزہ لینا چاہیے کہ ایک طرف وہ جمہوریت کے نام سے قوموں کے درمیان مساوات کی بات کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف ان کا عمل یہ ہے کہ وہ عرب ملکوں پر صیہونی تسلط قائم کرنے کے لیے اسرائیلی مظالم کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ اسی طرح عراق کو تباہ وبرباد کرنے، افغانستان کو ''تورا بورا'' بنانے، کوسووو میں انسانیت کا قتل عام کرنے، افریقہ کے ممالک میں سیاسی عدم استحکام اور اقتصادی تباہی اور بربادی مچانے کے فیصلے کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ایشیا اور افریقہ میں واقع ممالک میں سیاسی اور معاشی عدم استحکام پیدا کرنے کے لیے مراعات یافتہ طبقات، سرمایہ پرست حکمرانوں کی بے جا حمایت کرتے ہیں۔ اور آزادی اور حریت کو برقرار رکھنے والے ممالک ایران، لیبیا، وینزویلا اور دیگر چھوٹی اقوام کے خلاف بے جا پابندیاں لگانے اور انھیں اپنے مفادات کے حصول کے لیے زیر عتاب لانے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر استعماری اور سامراجی ممالک کا امتیاز پر مبنی یہ عمل قوموں کے حقوق کی ادائیگی کے راستے میں بہت بڑی رُکاوٹ ہے۔ دنیا بھر کے سنجیدہ اور باشعور لوگ بجا طور پر اقوام متحدہ کے اس دُہرے کردار کی مذمت کرتے ہیں۔ اور اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ اقوام عالم کا بین الاقوامی نظام اس انداز میں تشکیل پذیر ہونا چاہیے کہ جہاں تمام ممالک برابری کی سطح پر اپنے قومی حقوق کے حصول میں کامیاب ہوں اور کسی سامراجی ملک کا ان پر تسلط نہ ہو۔

(مدیر اعلیٰ)

مطالعہ سیرت کے عملی تقاضے

پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن

دین اسلام کی اصل شناخت انبیا علیہم السلام کی سیرت وکردار بالخصوص رسول اکرمؐ کے اُسوۂ حسنہ سے ہے۔ آپؐ نے ایسے معاشرے میں، جہاں بات بات پر جنگ وجدل ایک معمول کی بات تھی، اپنی سیرت وکردار سے امن کے لیے سازگار ماحول قائم کرنے کی نتیجہ خیز کوشش کی۔ قبل از بعثت حجر اسود کی تنصیب کا مرحلہ درپیش ہوا تو مکہ کے قبائل اس مذہبی سعادت کے حصول کے لیے آپس میں تناؤ کا شکار تھے۔ ہر قبیلے نے اس کو اپنی اَنا کا مسئلہ بنایا ہوا تھا۔ اور یہ اندیشے سر اُٹھانے لگے کہ مکہ کے قبائل ایک بار پھر برسرِ پیکار ہو جائیں گے اور معلوم نہیں کہ یہ جنگ وجدل کب تک جاری رہے۔ کیوں کہ ان کے ہاں پُرامن مفاہمت کا تصور کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ ایسے ماحول میں رسول اکرمؐ نے حجر اسود کی تنصیب کے لیے ایسا طریقہ اختیار کیا کہ قبائل کے مابین پُرامن بقائے باہمی کے اصول نے اپنی جگہ بنائی اور ایک چادر میں حجرِ اسود رکھ کر تمام قبائل کو اس کے پکڑنے میں حصہ دار بنایا۔ یوں کسی کی اَنا کو ٹھیس بھی نہ پہنچی اور ماحول کا کھنچاؤ ختم ہو کر رہ گیا۔ آپ کا یہی وہ طرزِ عمل تھا جس کو بعد ازاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور مشن آپؐ کے سپرد کر دیا گیا۔ یوں آپؐ ''رسول امن'' قرار پائے۔

آپؐ نے یثرب میں جس معاشرے کی داغ بیل ڈالی، اس میں مختلف نسلی قبائل اور اہل مذہب کو پُرامن بقائے باہمی کے اصول پر یکجا کر دیا۔ تہذیبی شناخت کو باہمی منافرت کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔ میثاق جمہوریتِ مدینہ اور مواخات کے سنہری اصولوں کے تحت بکھرے ہوئے معاشرے کو یک جہتی عطا کی اور وحدت انسانیت کے اصول پر تہذیبوں کے مابین مفاہمت کے تصور کو جنگ زدہ ماحول میں پروان چڑھایا۔ چناں چہ اسلام نے جہاد کا محور کسی قوم یا مذہب کو قرار نہیں دیا بلکہ ''فتنہ'' کو قرار دیا ہے۔ جو معاشرے میں ایک طبقے کی طاقت کے ذریعے اظہارِ حق کے فطری حق کو سلب کر کے ظلم وجبر کا نظام مسلط کر دیتا ہے۔ رسول اللہؐ نے ختم نبوت کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود دیگر تہذیبوں یا مذاہب کے قلع قمع کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ آپؐ کے ذریعے دنیا اس اصول سے آشنا ہوئی کہ قبولیت دین کے لیے کسی جبر اور دباؤ کی گنجائش نہیں۔ ایسا نہیں کہ یہ بات مکہ مکرمہ کے جبر زدہ ماحول میں کہی گئی ہو کہ مسلمان کم زور تھے، بلکہ یہ اصول مدینہ منورہ میں ریاستی بالادستی کے دور میں متعارف ہوا۔ چناں چہ مسلمانوں نے ہمیشہ دیگر مذاہب کے تہذیبی علاقوں کی حفاظت کی۔ انھوں نے گرجا گھروں، مندروں اور دیگر عبادت گاہوں کو گرا کر اپنا تہذیبی غلبہ قائم نہیں کیا۔ بلکہ ان کی حفاظت کر کے پُرامن بقائے باہمی اور تہذیبوں کے مابین مفاہمت کے سماجی خدوخال واضح کیے۔ اسلام جس خطے میں بھی پہنچا، اس نے وہاں کی تہذیب کو ملیا میٹ کرنے کے بجائے اس کے صالح پہلوؤں کی نہ صرف حفاظت کی، بلکہ ان کو مزید پروان چڑھایا۔ اسلام عالمِ انسانیت کی ہر سطح پر تقسیم کا شدید مخالف ہے، بلکہ کل انسانیت کی فلاح وبہبود کا ضامن ہے۔

آپؐ نے عدل وانصاف کے آفاقی اصول پر مبنی جو معاشرہ اور تہذیب قائم کی، اس میں کسی کو اس کے مذہب اور تہذیب کی بنیاد پر اچھوت بنانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ آپؐ کی سیرت کے ایسے کئی واقعات تاریخ میں رقم ہیں، جن میں آپؐ کی سیرت نے مسلم وغیر مسلم تنازعات میں کسی مذہبی یا تہذیبی وابستگی کو عدل وانصاف کے راستے میں رُکاوٹ نہ بننے دیا۔ موجودہ دور میں جب محاذ آرائی عروج پر ہے اور تہذیبی تصادم اور تقسیم انسانیت کے نظریات بحث ومباحثے کے میدان میں ہی نہیں بلکہ میدانِ جنگ میں بُری طرح کارفرما ہیں اور مغرب کی استحصالی تہذیب نے دنیا کو جہنم زار بنا دیا ہے۔ ایسی صورت حال میں رسول اللہؐ کی حسن سیرت کا یہ پیغام ہے کہ وحدت انسانیت کی اَساس پر پُرامن بقائے باہمی کے لیے عدل وانصاف کا قومی اور بین الاقوامی معاشرہ قائم کیا جائے، جس میں کسی ظالم قوت کو من مانی کا موقع نہ مل سکے اور کوئی قوم اپنی بے چارگی کے سبب حقوق سے محروم نہ کی جا سکے۔

www.rahimia.org

اصلاحِ احوال اور عصری تقاضے

شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد صاحب

(مؤرخہ: 31 جولائی 2009ء بمقام ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ، لاہور)   ضبط وتحریر: مولانا محمد جمیل

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم، امّا بعد: هُوَ الَّذِيٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ۝ (۹:۶۱) صدق اللّٰہ العظیم.

معزز دوستو! مسلمان جماعت کے کامیابی اس بات میں مضمر ہے کہ وہ حضوؐر کے لائے ہوئے دین اور تعلیمات کو دل وجان سے قبول کرے۔ اور پھر ان تعلیمات کی روشنی میں اپنی زندگی کی تعمیر و تشکیل کے لیے جدوجہد اور کوشش کرے۔ حضوؐر کی تعلیمات کے نتیجے میں ایک ایسی جماعت تیار ہونی چاہیے کہ جو پوری انسانیت کو دنیا اور آخرت میں کامیاب بنانے کی جدوجہد اور کوشش کرے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ دنیا میں انسانی ترقی کے لیے ایک تربیت یافتہ جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تربیت یافتہ جماعت ہی معاشروں کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

دنیا میں یہ اصول مسلمہ ہے کہ جو کام کرنا مقصود ہو تو اس کے لیے مہارت رکھنے والے افراد کو تلاش کیا جاتا ہے۔ اور پھر ان میں اس کام سے متعلقہ مہارتیں پیدا کی جاتی ہیں اور انھیں ایک نظم وضبط کے ماتحت منظّم کیا جاتا ہے۔ پھر وہ اس کام کے عملی نتائج حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ مسلمان کوئی فرقہ، گروہ یا مذہبی شناخت رکھنے والا طبقہ نہیں ہے، بلکہ مسلمان ایک جماعت کا نام ہے۔ وہ ایک منظّم اجتماعیت کا عنوان ہے۔ جس کے پیش نظر کچھ اہداف اور مقاصد ہوتے ہیں۔ وہ ان مقاصد واہداف کے حصول کے لیے انسانی معاشرے میں ایک کردار ادا کرتی ہے۔ مسلمان جماعت اس حوالے سے ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے کہ دیگر جماعتوں کے شعبے اور دائرے محدود ہیں۔ مثلاً نسلی دائرہ، علاقائی دائرہ یا زیادہ زور لگائیں گے تو صرف اپنے مذہب کے لوگوں کی فلاح و بہبود کا دائرہ بنالیا جاتا ہے۔ پھر ان محدود دائروں میں رہ کر وہ جماعتیں کام کرتی ہیں۔ اگر دنیا میں ترقی کے اہم اُمور کو سرانجام دینے کے مختلف شعبوں کو دیکھا جائے تو ان میں بھی انسانوں کی مہارتوں کا دائرہ بڑا محدود ہو جاتا ہے۔ یہ محدود دائرے رکھنے والی جماعتیں اپنے مخصوص دائروں میں شاید کچھ نتائج پیدا کریں لیکن دنیا اور آخرت میں انسانیت کو کامیاب بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسلمان جماعت کی ذہنی اپروچ بہت بلند ہو۔ اس کی صلاحیت وکردار جامعیت پر مبنی ہو۔ وہ جماعت انسانی مسائل کو درست تناظر میں سمجھ کر ان کو حل کرنے کی جدوجہد کرے۔ موجودہ دور میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہر شعبے کے لیے الگ ایک ماہر کی ضرورت ہے۔ تمام افراد اور جماعتیں تمام شعبوں میں مہارت حاصل نہیں کرسکتیں۔ یہ بات ذیلی اور جزوی شعبوں سے متعلق تو درست ہے۔ لیکن کسی ملک کا نظام چلانے، سماج کی تشکیل اور اس کے مسائل کو حل کرنے کے لیے مرکزی سطح پر ایک جماعت کا ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح مرکزی سطح پر حکمران اداروں کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر حکمران ادارے چلانے والے افراد کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ معاشرتی فرائض اور ذمہ داریوں سے مکمل آگاہی حاصل کریں۔ کیوں کہ اگر قانون سازی کرنے والے معاشرے کی شیرازہ بندی کے بنیادی اصولوں سے واقف نہیں اور اس میں مہارت نہیں رکھتے تو وہ ان اداروں سے مثبت نتائج حاصل نہیں کر سکتے۔ حکمران اداروں کے لیے ضروری ہے کہ ان کی صلاحیت، استعداد اور مہارت زندگی کے تمام شعبوں میں ہونی چاہیے تا کہ ادارے درست خطوط پر انسانیت کی فلاح کے لیے کردار ادا کرسکیں۔

حضوؐر نے بھی اس طرح کی ایک جماعت تیار فرمائی۔ چناں چہ صحابہ کرامؓ کی جماعت زندگی کے مختلف شعبوں میں مہارت رکھتی ہے۔ وہ جماعت حکمرانی کا نظام بھی قائم کرتی ہے۔ اور معاشرے میں موجود معاشی مسائل بھی حل کرتی ہے۔ نسب اور قوموں کے اَخلاق کی حفاظت کے لیے ''علم الانساب'' میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ اس کام میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی برابر کی شریک ہیں۔

چناں چہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے جن شعبوں میں مہارت حاصل کی، ان میں شعر، طب، علم الانساب، معاشرے کے سیاسی اور معاشی مسائل شامل ہیں۔ اور آپؓ کی قرآن وحدیث میں مہارت کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے صحابہ کرامؓ مسائل حل کرنے کے لیے ان کے پاس تشریف لاتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کے بعد آپؐ کی ازواجِ مطہرات میں سے جو سب سے زیادہ عالمہ ہیں وہ حضرت اُم سلمہؓ ہیں۔ حضرت اُم سلمہ کے فتاویٰ اور مسائل پر ایک مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ حضوؐر نے جو جماعت تیار فرمائی اس کی مہارت کسی ایک خاص شعبے میں نہیں، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں ان کی مہارت موجود ہے۔ تمام سماجی شعبوں پر ان کی نظر ہے۔ ان کے جو بھی مسائل ہیں ان کو حل کرنے کی سوچ ان میں موجود ہے۔ اس حوالے سے ان کے پاس کچھ انسانی اقدار ہیں۔

الغرض مسلمان ایک ترقی یافتہ اور کامیاب جماعت ہوتی ہے۔ جو اپنے دور کے تقاضوں اور مسائل سے نہ صرف واقف ہوتی ہے بلکہ ان مسائل کو حل کرنے کا ایک نظام بھی قائم کرتی ہے۔ اس کے لیے بڑی جدوجہد کرتی ہے۔ مسلمان جماعت کا دائرہ محدود نہیں ہوتا۔ وہ نہ تو تنگ نظری پر مبنی ہوتا ہے، اور نہ اس میں جمود ہوتا ہے، بلکہ ان میں اعلیٰ درجے کی وسعت نظری ہوتی ہے۔ انسانیت کی ہمدردی اور خیرخواہی ہوتی ہے۔ ان کو مسلسل ترقیات دینے کی جدوجہد اور کوشش ہوتی ہے۔ معاشرے کو کسی ایک جگہ پر ٹھہرا دینا، جمود پیدا کر دینا، نئی ترقیات اور دریافتوں کو پیش نظر نہ رکھنا، یہ دین اسلام کی تعلیمات کا حصہ نہیں ہے۔ اصل میں تو دین کی تعلیمات اِن مذکورہ اُمور سے برأت کا اعلان کرتی ہیں۔ بلکہ مسلمان جماعت تو ان مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کرتی ہے۔ مسلمانوں کی گزشتہ چودہ سو سال کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ ہر دور کے اولوالعزم لوگوں نے جب ان کے سامنے نئے مسائل آئے، اور نئی صورتِ حال پیش آئی تو ان لوگوں نے اپنے دور کے مسائل حل کرنے کے لیے اجتہاد کیا اور اس دور کے مسائل حل کرنے کے لیے خوب سوچا اور غور وفکر کیا۔

الغرض چودہ سو سال سے مجددین صوفیا، علمائے ربانیین اور عدل وانصاف کی ذمہ داری اُٹھانے والے انصاف پسند حکمرانوں کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ کے بیان کردہ اور صحابہ کرامؓ کی جدوجہد کے نتیجے میں سامنے آنے والے بنیادی اُمور اور اَخلاق کو پیش نظر رکھ کر اپنے دور کی تعمیر وتشکیل کی جائے۔ ان کے فکر وعمل میں ہمیشہ یہ بات رہی کہ ہر دور کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے جدوجہد اور کوشش ہونی چاہیے۔ اس لیے ہم ماضی میں دیکھتے ہیں کہ ہر پچاس یا سو سال کے بعد فقہ وفتاویٰ کی ایک نئی کتاب سامنے آتی ہے۔ قانون کی تشکیل کے حوالے سے نئے امور سامنے آتے ہیں۔ سماج کی ترقیات کے لیے ایک نئی صورت سامنے آتی ہے۔ ذرا گہرائی کے ساتھ ماضی کا جائزہ لیا جائے۔ حکمرانوں کا جائزہ لیا جائے۔ ایران، مصر اور خود ہندوستان کی تاریخ کا تجزیہ کیا جائے تو ہر دور کے صوفیا، علما اور بادشاہوں نے اپنے دور کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ اس دور کے مسائل کو سمجھا اور ان کو حل کرنے کا بنیادی قاعدہ اور قانون تشکیل دیا۔ اس لیے اس ہندوستان میں مسلمانوں کے غلبے کے دور میں ہر صدی میں ایک نیا فقہی قانونی مجموعہ سامنے آتا ہے۔ ان میں فقہ کی آخری کتاب جو عالم گیرؒ نے مرتب کرائی ''فتاویٰ عالم گیری'' کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اس سے پہلے تقریباً فقہ اور قانون کی دس کتابیں ہیں جو تقریباً ہر صدی میں یہاں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے کردار ادا کرتی ہیں۔

اگر مسلمان معاشروں میں جمود ہوتا تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ مسلمانوں کے غلبے کے ہزار، بارہ سو سالہ دور میں فقہ وقانون پر کتابیں تصنیف نہ کی جاتیں۔ حال آں کہ فتاویٰ کی یہ کتابیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ہر دور کے مسائل کے حل کے لیے ایک سسٹم اور نظام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور نظام ہمیشہ تصورات وتخیلات سے نیچے اُتر کر زمینی حقائق کی بنیاد پر بنتا ہے کہ زمین کے معروضی مسائل کیا ہیں؟ دور کے حقیقی تقاضے کیا ہیں؟ مشکلات کیا ہیں؟ ان کو حل کرنے کا قانونی راستہ کیا ہے؟ اور سسٹم کیسے تشکیل

www.rahimia.org

پذیر ہونا چاہیے؟ ہمارے ہاں اَلمیہ یہ ہے کہ دور کے حقیقی مسائل کو جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ معروضی حقائق کا ادراک نہیں کیا جاتا۔ اس بات کے نعرے لگائے جاتے ہیں کہ قرآن نافذ کرو، حدیث نافذ کرو، اسلام زندہ باد۔ اب صرف نعرہ لگانے سے تو دنیا میں نتائج نہیں نکلتے بلکہ نتائج اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب کہ ان اصولوں کی روشنی میں دور کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر مسائل حل کرنے کے لیے کردار ادا کیا جائے۔ انسانیت کے مسائل حل کیے جائیں۔ ان کی مشکلات دور ہوں۔

اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ گزشتہ دو اڑھائی سو سال سے مسلمان معاشرے زوال کا شکار ہیں۔ مرعوبیت اور مغلوبیت کی حالت میں ہیں۔ وہ اپنی آزادی و حریت سے محروم ہیں۔ یہ برِعظیم پاک و ہند اورنگ زیبؒ عالم گیر کے بعد داخلی طور پر مسلسل انتشار کی وجہ سے انگریز سامراج کے زیرِ تسلط رہا ہے۔ غلامی کی حالت اس پر مسلط رہی ہے۔ 1757ء میں سراج الدولہ کی شکست سے لے کر 1947ء تک تقریباً دو سو سالہ دور میں اس ہندوستان کے مختلف علاقے غلامی کے گہرے گڑھے میں بتدریج گرتے چلے گئے۔ 1757ء سے 1799ء تک پورا جنوبی ہندوستان انگریز کے زیرِ قبضہ آ گیا۔ اس کے بعد 1803ء میں دلی انگریز کے قبضے میں چلا گیا۔ 1844ء کے بعد سندھ اور شمالی ہندوستان انگریز کے قبضے میں چلا گیا۔ اور اس کے بعد تقریباً ایک سو سال انگریز کا سیاسی اور معاشی نظام ہم پر مسلط رہا۔ اب اس بنیادی حقیقت کی موجودگی میں نوآبادیاتی دور کے سامراجی سسٹم سے نکلے بغیر محض آنکھیں بند کر کے اسلام کے نفاذ کی باتیں کرنا غلط تصور اور بڑی چھوٹی ذہنیت کی بات ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس غلامی کے اثرات و نتائج کیا مرتب ہوئے؟ اس غلامی کے زمانے میں جو سسٹم تشکیل دیے گئے، عدلیہ بنائی گئی، معاشرتی تشکیل کے اصول و قوانین وضع کیے گئے، وہ کیا تھے؟ اور ان غلامانہ طریقوں نے انسانی زندگی کو کس حد تک اور کس انداز میں متاثر کیا۔ غلامی دراصل انسانوں کی روح تک کو غلام بنا لیتی ہے۔ خاص کر جب کہ غلامی کا دورانیہ طویل ہو اور اس کے خلاف مزاحمت نہ کی جائے۔ بلکہ آزادی و حریت پسند تحریکوں سے غداری کرنے والے لوگ سامراج کو اسی علاقے سے مل جائیں تو پھر صورت حال کیا ہوگی۔ آپ بتلائیں کہ غلامی کے اس خوف ناک اثرات و نتائج سے نکلے بغیر مسائل کیسے حل کیے جا سکتے ہیں؟

آج کے دور میں ہمارا اسلام پسند طبقہ بڑا خوش ہوتا ہے کہ ہم نوآبادیاتی دور کے تربیت یافتہ حکمرانوں سے اسلام نافذ کرا لیں۔ ہم مطالبہ کریں کہ ہماری پارلیمنٹ اسلام کے مطابق قانون بنا دے۔ ہماری عدلیہ اس کے مطابق عمل درآمد کرا دے۔ انتظامیہ اسلام کی بنیاد پر نظام بنا دے۔ لیکن کبھی ہم نے سوچا؟ کہ ہمارے حکمران، عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ جو کہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں پر مشتمل ہے، یہ اسی غلامی کے دور کا تسلسل ہے۔ عدلیہ اسی عدالتی نظام کا تسلسل ہے جو کہ غلامی کے دور میں تھا۔ سیاست انھیں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے بھری ہوئی ہے، جو نوآبادیاتی دور کے پیدا کردہ ہیں۔ مسلح اور سول بیوروکریسی کی تربیت غلامی کے دور کے تقاضوں کے مطابق ہوتی ہے۔ جیسے کہ موروثی اَمراض آنے والی نسلوں میں منتقل ہوتے ہیں، اسی طرح معاشروں میں پیدا شدہ امراض کا اگر علاج نہ کیا جائے تو وہ بھی اگلی نسلوں کو منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آپ اندازہ لگائیں کہ 1857ء میں غداری کا ارتکاب کرنے والوں کی نسلیں اگر یہاں حکمران ہوں اور حکومتوں کے اہم مناصب پر فائز ہوں تو آج بھی وہی نتائج نکلیں گے جو سابقہ دور میں نکلے تھے۔ آج ہم یہ دعویٰ کریں کہ ہم ان سے اسلام نافذ کرا لیں، مساجد سے اس کا اعلان کرا لیں، محض وعظ کہہ دیا جائے، صرف اچھا لٹریچر لکھ لیا جائے تو یہ طریقہ درحقیقت سماجی عقل اور دینی شعور کے خلاف ہے۔

حضورؐ کی تعلیمات ہمیں اس مرکزی نقطے کو سمجھاتی ہیں کہ قریشیوں کے نظام کو توڑے بغیر نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ قریش میں سے انقلابی جماعت تیار کیے بغیر معاشرے میں مثبت نتائج پیدا نہیں ہو سکتے۔ جب تک ظالمانہ ذہنیت رکھنے والے مکہ کے یہ قریشی راستے سے نہ ہٹائے جائیں، اور لوگ پرانے سیاسی اور معاشی نظام کو مکمل طور پر نہ چھوڑیں، اس وقت تک مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اور جب تک قریشیوں کا نوجوان طبقہ دینِ اسلام کا انقلابی نظریہ اور سماجی تشکیل کے نئے اصول اور انقلابی سوچ قبول نہیں کرے گا، کامیابی ممکن نہیں ہوگی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت بلالؓ، حضرت یاسرؓ جیسے صحابہ کرام اپنے سابقہ نظریات اور نظام سے مکمل طور پر بغاوت کرتے ہیں تو صحابہ کی جماعت وجود میں آتی ہے۔ اور پھر زندگی کے ہر شعبے میں وہ تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ اس طرح نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ قریش میں سے جو لوگ اس نظریے کو قبول نہیں کرتے تو جب تک ان کو راستے سے ہٹایا نہیں جائے گا۔ اس وقت تک کام نہیں بنے گا۔ کیوں کہ ان کے نظریات اور نظام تو پورے معاشرے کو یرغمال بنانے والا ہے۔ یہ گروہ اگر باقی رہتا ہے تو ان کے برے اثرات معاشرے پر مرتب ہوتے رہیں گے۔ جب تک دور کے حقیقی تقاضوں کو پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا، کامیابی نہیں ہوگی۔

آج ہمارا بڑا مسئلہ غلامی، غلامانہ ذہنیت اور غلامی کے اثرات و نتائج ہیں۔ جنھوں نے بطور سسٹم کے ہمارے پورے معاشرے کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ غربت، جھوٹ اور بدامنی کے نظام نے پورے معاشرے کو جکڑ رکھا ہے۔ غلامی کے اس نظام کو توڑے بغیر نتائج نہیں نکل سکتے اور پھر ہمیں اس بارے میں بھی عقل و شعور ہونا چاہیے کہ صرف نظام توڑنا ہی کافی نہیں ہوتا، بلکہ سماج کی نئی تعمیر کی سوچ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اور سماجی تقاضے، سیاسی شعور اور اقتصادی اور معاشی حقائق کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔ جب ابوجہل وغیرہ قریشی سرداروں کو راستے سے ہٹایا گیا تو اس وقت عرب میں قیادت کے خلا کو پُر کرنے کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ جیسے لوگ موجود ہیں۔ جو ان سے بہت زیادہ بہتر قیادت کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے صحابہ کرام کی جماعت نہ صرف عرب میں عادلانہ نظام کو قائم کرتی ہے بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی عدل کو غالب کرتی ہے۔ اور انسانیت کے مسائل کو حل کرنے کا نظام بناتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ظالمانہ نظام کے مقابلے کے لیے اس سے زیادہ طاقت ور جماعت بنانے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہی جماعت کردار ادا کرتی ہے۔

یہ انبیاؑ کی سنت ہے کہ جس پر ہر دور میں علمائے مجددین اور سچے لوگوں نے جماعت تیار کی۔ تاکہ وہ اس کے ذریعے سے معاشرتی تشکیل میں اپنا کردار ادا کریں۔ آپ اندازہ لگائیں کہ اس برِعظیم میں جب حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت الامام شاہ ولی اللہؒ نے اپنے اپنے ادوار میں قائدانہ کردار ادا کیا تو ان حضرات کے ساتھ ایک مکمل جماعت تھی۔ گزشتہ تاریخ میں یہ بات ثابت شدہ حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ آج کے دور میں جماعت سازی کا یہ تصور ہمارے ذہنوں سے نکل گیا۔ آج ہماری خانقاہوں میں انفرادی اصلاح کی سوچ موجود ہے۔ ہمارے مدارس میں انفرادی نقطۂ نگاہ سے تعلیم کا نظریہ پایا جاتا ہے۔ اور اگر جماعتیں ہیں بھی تو وہ افراد کی خواہشات کے تابع ہیں اور مخصوص طبقات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اصل کام جو کہ افراد سازی کا ہے، افراد کی تربیت کرنے کا ہے، ان کو درست خطوط پر منظم کرنے کا ہے، اس کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ انبیا کی سنت تو یہ ہے کہ ایک ایسی جماعت تیار کی جائے کہ جو نہ بکنے والی ہو، نہ جھکنے والی ہو۔

ہندوستان غلام ہوا تو یہاں کے علما، صوفیا اور مشائخ کی جدوجہد کا نتیجہ بہت اچھا رہا۔ انھوں نے بھی انبیا کے طریقے کے مطابق جماعت بنانے کا کام کیا ہے۔ افراد کو منظم کیا۔ ان کی تربیت کی۔ چناں چہ اس ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اپنی پوری جماعت کے ذریعے سے یہ باور کرایا کہ اہلِ علم کا کام صرف کتابیں یاد کر لینا نہیں، بلکہ وہ بادشاہوں کے غلط کاموں کا محاسبہ بھی کریں۔ ان کو درست کرنے کی حکمت عملی اختیار کریں۔ حضرت مجدد صاحبؒ کے بعد حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کی جماعت کا دو سو سالہ دور ہے۔ جس میں انھوں نے غلامی کو سمجھا اور اس کے مقابلے میں ایک مزاحمتی سوچ پیدا کی کہ اس دور کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس غلط نظام کو توڑا جائے۔ گویا امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے لے کر حضرت سندھیؒ، حضرت مدنیؒ اور حضرت رائے پوریؒ تک پورا تاریخی تسلسل ہے۔ ہمیں بنیادی طور پر دینِ اسلام کی ان تعلیمات کو سمجھنا ہے جو کہ معاشرتی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں دین کی حقیقت کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

کا انقلابی کردار

سید نفیس مبارک ہمدانی

دنیا کی کوئی قوم یا جماعت اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کر سکتی، جب تک کہ وہ اپنے حقیقی رہبر ورہنما کی حیات سے واقفیت اور عملی مطابقت نہ رکھتی ہو۔ اس تناظر میں بحیثیت مسلمان ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اپنے اُس کامل واکمل رہنما کی سیرت سے آگاہی حاصل کریں، کہ جس سے ہمیں زندگی کے ہر پہلو پر مکمل رہنمائی حاصل ہو۔ اس حوالے سے جب ہم نظر دوڑائیں تو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی قدر ہمارے سامنے آتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳:۲۱) کہ "تمہارے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اچھا نمونہ (عملی کردار) ہے"۔

جب تک ہم حضور اکرم ﷺ کی سیرت سے مکمل واقفیت حاصل نہ کر لیں، تب تک ہم اپنے نظریے اور ایمان کو بھی مکمل طور پر واضح نہیں کر سکتے، کیوں کہ آپؐ کی سیرت مبارکہ ہی ہمارے نظریے اور ایمان کا عملی مظہر ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ ہی ہمارے لیے ایک ایسا نمونہ ہے کہ جس کے ذریعے ہم زمین پر بسنے والی تمام اقوام وملل کے اقتصادی، سیاسی، اَخلاقی اور معاشرتی قوانین حیات کو انسانی بنیادوں پر پرکھ سکتے ہیں کہ وہ انسانوں کے لیے کیوں کر مفید ہیں۔ خواہ وہ "اقترابات" (اللہ تعالیٰ سے قرب حاصل کرنے کے طریقے) مثلاً نماز، روزہ، عبادات کا مکمل نظام ہو یا "ارتفاقات" (دنیاوی معاملات کو بہتر انداز میں چلانے کے طریقے) مثلاً سیاسیات، معاشیات، اَخلاقیات، عائلی زندگی کے قوانین، جنگ وجدل کے اصول اور انسان دوستی کے اصول وقوانین ہوں۔ الغرض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک کامل واکمل ترین شخصیت ہیں کہ جن کی حیاتِ مبارکہ ہمیں زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

ہمارے لیے لازم ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کامیاب زندگی گزارنے اور دنیاوی واُخروی حوالے سے ترقی حاصل کرنے کے جن اصولوں کو دنیا میں متعارف کروایا ہے، ان کو اپنائیں۔ اور منظّم اور شعوری جدوجہد کے ساتھ اپنے معاشرے میں ان کو غالب کرنے کی سعی وکوشش کریں۔ اس کی راہ میں آنے والی رُکاوٹوں کا عقل مندی اور ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔ ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ سے زندگی کے ہر پہلو پر رہنمائی حاصل کرنی ہے۔ وہ خدائے عزوجل سے اپنا تعلق قائم کرنے کے حوالے سے عبادات کا مکمل نظام ہو یا قوموں کے نظامہائے سیاسی ومعاشی چلانے ہوں۔ میدانِ جنگ کے اصول وقوانین ہوں یا اخوت، ہمدردی اور بھائی چارے کے پھیلانے کا عمل ہو، ہر ایک شعبے کو اپنانا ضروری ہے۔ یہ درست نہیں ہے کہ ہم سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو محض چند عبادات تک محدود کر دیں یا محض اقترابات کی حد تک رکھیں یا محض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے حوالے سے چند نعتوں کے پڑھنے کو منشائے حیات بنا لیں۔ اور آپؐ کے عملی اور انقلابی کردار کو پس پشت ڈال کر چند خود ساختہ باتوں کو دین سمجھ بیٹھیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حکیم کے فطری اصولِ حیات پر مبنی جس کامل واکمل دین کا تعارف کرواتے ہیں، اس کو اپنے معاشرے میں غالب کرنے کی محنت اور جدوجہد بھی کرتے ہیں۔ آج ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور اگر سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی درجے میں عمل کرتے بھی ہیں تو محض رَسمی اور غیر شعوری بنیادوں پر۔ جس کے نتیجے میں ہمارے معاشرے کے اندر اجتماعی حوالے سے کوئی خاطر خواہ تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ ہم سیرت النبیؐ کو محض اپنی حد تک انفرادیت میں محدود کر لیتے ہیں، جب کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک ایک پہلو ہمیں اجتماعیت کی دعوت دیتا ہے کہ علم، سوچ وفکر اور عمل میں ہمیشہ اجتماعیت کو مدنظر رکھا جائے۔ اسی بنیاد پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کا اگر بنظرِ عمیق مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ آپؐ نے قرآنی نظریے کے مطابق اپنے معاشرے کے ہر شعبے میں بطورِ نظام دوررَس تبدیلیاں کی ہیں۔ اور ایسا معاشرہ کہ جس میں انسانیت کا تعلق اپنے خدا سے کٹ چکا تھا، معاملات میں دھوکہ دہی، چوری، زنا، ظلم وناانصافی، حقوق کو غصب کرنا اور نسلی بنیادوں پر زبردست امتیاز پایا جاتا تھا۔ اقترابات وارتفاقات کے فطری قوانینِ حیات زنگ آلود ہو چکے تھے۔ ایسے ماحول اور نظام میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر ایک انقلاب پیدا کیا۔ انسانیت کی دَبی ہوئی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے عدل وانصاف پر مبنی ایک مثالی معاشرہ تشکیل دیا۔

چناں چہ معلوم ہوا کہ نبوت کا مقصد محض چند عبادات یا چند اَخلاقیات کا ہی سبق دینا نہیں ہے، بلکہ معاشرے کے ہر شعبۂ حیات میں مکمل طور پر ظلم کے نظام کو ختم کر کے عدل وانصاف کے نظام کا قیام ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کی نبوت اور رسالت کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷:۲۵) "ہم نے انبیا علیہم السلام کو واضح نشانیاں (عدل وانصاف پر مبنی معاشرہ کے اصول) دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کیا تا کہ انسانیت انصاف پر قائم رہے۔" اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد فرمایا: اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۷۹:۱۷) کہ "فرعون کی طرف جاؤ اس لیے کہ اس نے سرکشی اور ظلم واستبداد کا نظام قائم کر رکھا ہے۔" اور ہم دیکھتے ہیں کہ انبیا علیہم السلام نے اپنی اپنی قوم میں اسی مقصد اور ہدف کے لیے جدوجہد اور کوشش کرتے ہوئے ایک سماجی اور معاشرتی تبدیلی کی دعوت دی ہے۔ اور اسی مقصد کے حصول کے لیے نبی آخر الزماں، رسول خدا، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جدوجہد کی اور سب سے پہلے اپنی سرزمین میں ایک تربیت یافتہ جماعت کے ذریعے اپنی قوم کے ظالم طبقہ ابوجہل، عتبہ، شیبہ کے انسانیت کُش نظام کو ختم کیا اور اس راہ میں جتنی تکلیفیں آپؐ کو اُٹھانا پڑیں اس سے کوئی ذی ہوش مسلم اور غیر مسلم نابلد نہیں ہے۔ اس کے بعد دوسرے ممالک کی طرف رُخ کیا اور خطوط لکھے اور صحابہ کرامؓ کی جماعت کے ذریعے مشرق ومغرب میں انسانی بنیادوں پر ایک عادلانہ نظام قائم کیا۔

آج اَلمیہ یہ ہے کہ موجودہ دَورِ زوال میں ہمارے ہاں بہت سے مکاتبِ فکر اور پلیٹ فارمز پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر انفرادی نقطۂ نگاہ سے تو بہت کچھ بحث ومباحثہ کیا جاتا ہے، لیکن آپؐ کی سیرت سے سماجی تبدیلی کے حوالے سے کوئی رہنمائی نہیں لی جاتی اور نہ اس کو نظام کی حیثیت سے عمل میں لانے کی حکمتِ عملی اپنائی جاتی ہے۔ جب کہ کسی اعلیٰ شخصیت کی زندگی پر محض بہترین مکالمے کر لینے سے ان کی عملی زندگی کھل کر سامنے آ سکتی ہے اور نہ محض نعرے لگانے سے عمل کا کوئی طریقہ کار اپنایا جا سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج 63 سال گزر جانے کے باوجود نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے والی اور آپؐ کے نام پر جان قربان کرنے والی قوم میں سیرت نبویؐ کے حوالے سے کوئی خاطر خواہ تبدیلی نظر نہیں آتی۔

اس تناظر میں آج زوال کے دَور میں ضرورت اس اَمر کی ہے کہ سیرتِ نبیؐ اور اس کے اجتماعی تقاضوں کا صحیح شعور حاصل کیا جائے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے اجتماعی اور سماجی تبدیلی کے حوالے سے بھی آگہی حاصل کی جائے۔ اور اس پر حکمت عملی ترتیب دیتے ہوئے ملک میں قائم فرسودہ، ظالمانہ نظام کو ختم کر کے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں انسانی بنیادوں پر عدل وانصاف کا نظام قائم کرنے کی جدوجہد اور کوشش کی جائے۔ تا کہ ہم اپنی دنیا وآخرت کو جنت بنا سکیں اور انسانیت سکون کا سانس لے سکے۔ یہی انسانیت کی معراج ہے۔ اور تب ہی ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کا صحیح حق ادا کر سکتے ہیں۔

www.rahimia.org

رفتارِ کار

ادارہ رحیمیہ میں تربیتی ورکشاپ کا انعقاد

عتیق الرحمٰن ایڈووکیٹ

علوم قرآنیہ کی اساس پر سماجی تشکیل کے حوالے سے ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ کا تعلیمی اور تربیتی نیٹ ورک پورے ملک میں کام کر رہا ہے۔ اس میں لیکچر دینے والے سینئر محاضرین کی تربیت کے لیے مؤرخہ 5، 6، 7 فروری 2010ء کو ادارے میں تین روزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ چناں چہ ملک بھر سے سینئر محاضرین نے اس ورکشاپ میں شرکت کی۔ اس سے قبل ادارے کی مجلس مشاورت کا اجلاس بھی منعقد ہوا۔ جس میں ملک بھر میں تعلیمی و تربیتی اُمور کی انجام دہی کے لیے سالانہ شیڈول کی منظوری دی گئی۔ اس ورکشاپ میں آئندہ ششماہی میں زیر بحث آنے والے موضوعات پر بریفنگز، تبادلۂ خیالات، سوال و جواب اور پینل مذاکرے پر مشتمل نشستوں کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں ملک بھر سے آئے ہوئے احباب نے بھرپور شرکت کی۔ اس ورکشاپ کے اختتام پر ادارہ رحیمیہ کے صدر جناب ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن صاحب نے حالات حاضرہ پر سوالات کے جوابات بھی دیے۔ اور سب سے آخر میں سرپرست ادارہ حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ نے دینی کام کے فروغ کی دعوت، تربیت اور تنظیمی صلاحیت کے حصول کے حوالے سے نصیحت آموز خطاب فرمایا۔ یہ ورکشاپ حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کی دعا سے اختتام پذیر ہوئی۔

حضرت اقدس رائے پوری کا دورۂ راولپنڈی

مؤرخہ 16 فروری 2010ء کو صبح 08:00 بجے حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ راولپنڈی جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس سے قبل رات گئے شیخ فرید احمد راولپنڈی سے حضرت کو لینے کے لیے تشریف لا چکے تھے۔ جب کہ 15 فروری کی شام حضرت مولانا ڈاکٹر محمد افضل جو کہ خانقاہ عالیہ رحیمیہ رائے پور سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں، کی والدۂ محترمہ ''گوجر خان'' کے قریب ایک گاؤں میں انتقال پا چکی تھیں۔ ان کی نماز جنازہ میں شرکت کے لیے حضرت اقدس رائے پوری اپنے رُفقا ناظم اعلیٰ ادارہ رحیمیہ اور حضرت مولانا مفتی عبدالمتین نعمانی کے ہمراہ 01:00 بجے گوجر خان کے قریب ان کے گاؤں ''گورسیاں'' میں تشریف لائے۔ نماز ظہر کے بعد تقریباً 03 بجے حضرت اقدس مدظلہ العالی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور کچھ دیر وہیں قیام فرمایا۔ عصر کی نماز کے بعد گورسیاں سے روانہ ہو کر عشا کی نماز کے قریب راولپنڈی شیخ افتخار احمد کے مکان پر پہنچنا ہوا۔ اور اگلے تین چار روز وہیں قیام رہا۔ اس دوران ان کے مکان پر روزانہ مجلس ذکر منعقد ہوتی رہی۔ اور مجلس ذکر کے بعد دینی موضوعات پر حضرت مولانا مفتی عبدالمتین نعمانی، ناظمِ اعلیٰ ادارہ رحیمیہ حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد اور حضرت مولانا مفتی مختار حسن کے بیانات ہوتے رہے۔ نیز سوال و جواب کی نشستوں کا انعقاد بھی ہوا۔ اس دوران مؤرخہ 20 فروری، بروز جمعۃ المبارک کو جامع مسجد محمدی، اسلام آباد میں نماز جمعہ سے قبل ناظمِ اعلیٰ ادارہ رحیمیہ نے خطاب فرمایا۔ اور نماز جمعہ پڑھائی۔ جمعہ کی نماز کے بعد سینکڑوں احباب نے حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے ہاتھ پر توبہ اور بیعت کی۔ اور اس موقع پر ذکر اللہ اور توبہ کی اہمیت پر حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد نے خطاب فرمایا۔ اور حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ نے بھی چند نصائح ارشاد فرمائیں۔ 20 فروری کی شام کو جناب جاوید حمید صاحب کے چچازاد بھائی جناب یاسر حنیف کی تقریب نکاح میں حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ نے شرکت کی اور نکاح پڑھایا۔ جب کہ 21 فروری کو ان کے ولیمے کی دعوت میں بھی شرکت کی۔ اور اسی روز لاہور کے دوست جناب ساجد محمود چوہدری کی بارات راولپنڈی آئی اور ان کی تقریبِ نکاح میں بھی حضرت اقدس نے شرکت فرمائی اور نکاح پڑھایا۔ 22 فروری کی صبح کو راولپنڈی سے لاہور کے لیے واپسی ہوئی اور اسی تاریخ کو ان کی دعوت ولیمہ میں شرکت کی۔ اس موقع پر حضرت اقدس نے ان دونوں احباب کو شادی کی مبارک باد دی۔

خوش خبری

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) کراچی شاخ کا افتتاح

سلسلۂ عالیہ رحیمیہ رائے پور اور ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) سے وابستہ احباب کے لیے ایک بڑی خوش خبری یہ ہے کہ ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ کا تعلیمی اور تربیتی دائرۂ کار وسعت اختیار کر رہا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی صوبہ سندھ کے دو اہم مرکزی مقامات یعنی کراچی اور سکھر میں ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ کی شاخیں قائم کی جا چکی ہیں۔ احباب نے بڑی جدوجہد اور کوشش سے کراچی میں ادارے کے لیے ایک مکان حاصل کیا ہے۔ جس میں ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کا افتتاح مؤرخہ ۹/ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ/ 24 فروری 2010ء بروز بدھ کو حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ کے دستِ مبارک سے ہوا۔ مغرب کی نماز سے ذرا قبل 6 بجے حضرت اقدس رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ نے ادارے میں نصب افتتاحی تختی کی نقاب کشائی کی۔ اس موقع پر ناظمِ اعلیٰ ادارہ رحیمیہ حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد اور ادارے کی مجلس مشاورت کے اراکین جناب مولانا مفتی عبدالقدیر (چشتیاں)، جناب مولانا مفتی مختار حسن (نوشہرہ)، جناب آفتاب احمد عباسی (کراچی)، اور معاونین رحیمیہ جناب جان محمد گدارو (کراچی)، جناب وسیم اعجاز (کراچی)، عرفان احمد لون (کراچی)، مولانا ہدایت اللہ (کراچی) بھی موجود تھے۔ اس افتتاحی تقریب میں کراچی کے علمائے کرام میں مولانا عطاء الرحمٰن شیرازی، مہتمم جامعہ شیرازیہ، مولانا مفتی اللہ بخش، مولانا محمد عثمان غنی، مولانا ضیاء الرحمٰن، مولانا عبدالمتین قریشی خطیب جامع مسجد امام المتقین، مولانا زوہیب حسن، مولانا غلام مصطفیٰ فوز، مولانا محمد مظہر معاویہ، مولانا سعد احمد خان اور دیگر سینکڑوں احباب نے بھرپور شرکت کی۔ افتتاح کے بعد نماز مغرب یہاں ادا کی گئی اور اس کے بعد اس ادارے میں سب سے پہلے مجلس ذکر منعقد ہوئی۔ مجلس ذکر اور عشا کی نماز کے بعد افتتاحی خطابات ہوئے، جس میں سب سے پہلے جناب انجینئر آفتاب احمد عباسی نے ابتدائی گفتگو فرمائی۔ اور اس ادارے کے قیام کے حوالے سے دوستوں نے جو محنت اور جدوجہد کی تھی، اس کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان کے بعد جناب مولانا مختار حسن نے ''مراکزِ دینیہ کی اہمیت'' پر خطاب فرمایا۔ اس کے بعد ناظمِ اعلیٰ ادارہ رحیمیہ نے ادارے کے اغراض و مقاصد اور علوم قرآنیہ کے دس علوم پڑھائے جانے کی تفصیلات اور ادارے کی دیگر سرگرمیوں کی وضاحت کی۔ اور مفصل خطاب فرمایا۔ آخر میں حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ نے مختصر نصائح اور ارشادات فرمائے۔ اور دعا فرمائی۔ کراچی میں ادارہ رحیمیہ کراچی شاخ کا پتہ یہ ہے: A/9، سینٹر پوائنٹ سوسائٹی، بلاک نمبر 21، راشد منہاس روڈ، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون نمبر: 6320707 , 021-6321616

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) سکھر شاخ کا افتتاح

مؤرخہ: ۲۱/ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ/ 8 مارچ 2010ء بروز سوموار کو حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ کراچی سے سکھر تشریف لائے۔ ان کے ہمراہ ناظمِ اعلیٰ ادارہ رحیمیہ حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد بھی تھے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ سیدھے سکھر میں ادارہ رحیمیہ کے لیے خریدے گئے فلیٹ میں تشریف لائے اور افتتاحی تختی کی نقاب کشائی کی۔ اور دعا فرمائی۔ اس موقع پر سکھر ریجن سے تعلق رکھنے والے احباب سینکڑوں کی تعداد میں موجود تھے۔ خاص طور پر جناب ڈاکٹر سید لیاقت علی شاہ (سکھر)، جناب سید اصغر علی شاہ (پیر جو گوٹھ، خیر پور)، مولانا عبداللہ عابد سندھی (شکار پور)، جناب نور الدین سومرو (شکار پور)، جناب آصف رضا میمن (خیر پور)، جناب عبدالجلیل انڑ (شکار پور) وغیرہ احباب نے شرکت کی۔

سکھر شاخ کا پتہ: فلیٹ نمبر 111، فلور i، رائل اپارٹمنٹ، ریس کورس روڈ، سکھر۔

www.rahimia.org

Monthly RAHIMIA Lahore LRL 466 CPL No. 59

نظامِ عدل وانصاف کے قیام کی جدوجہد انبیا کی سنت ہے

خطاب حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ

مؤرخہ 7,6 فروری 2010ء کو ادارہ رحیمیہ میں سینئر محاضرین کی تربیتی ورکشاپ منعقد ہوئی، اس کے اختتام پر سرپرستِ اعلیٰ ادارہ رحیمیہ دامت برکاتہم العالیہ نے نصیحت آموز خطاب فرمایا، جو درج ذیل ہے۔

الحمدللہ! اس وقت اللہ تعالیٰ ہم سے جو کام لے رہا ہے، وہ اہل حق سے جوڑنے کا ہے۔ آج ہمارے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ جس نظریے پر قربانیاں دی گئی ہیں، ہم اسی راستے پر اپنے نوجوانوں کو چلانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اس راستے پر ہم نے بہت زیادہ صبر اور استقامت کے ساتھ چلنا ہے، تب کامیابی نصیب ہوگی۔ ہمیں اس بات کو بڑی گہرائی کے ساتھ سمجھنا چاہیے کہ یہاں پر جتنی بھی تبدیلیاں آتی ہیں، ان کے باوجود سسٹم اور نظام تو وہی رہتا ہے۔ صرف چہرے اور افراد بدلتے ہیں۔ انشاءاللہ یہ جماعت تربیت حاصل کرلے اور اپنی تنظیمی صلاحیت کو بڑھالے اور اپنے اسلاف سے تعلق کو مضبوط بنالے تو نتائج نکلیں گے۔ ہمارے لیے یہ بڑی فخر کی بات ہے کہ ہم جس جماعت سے اپنا نظریہ اور فکر لیتے ہیں وہ ایک مثالی جماعت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ امام شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی سے ہماری وابستگی ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کی خانقاہوں سے ہمارا تعلق ہے۔ اس لیے اس پر ہمیں بڑا فخر ہونا چاہیے۔ گویا کہ یہ باتیں ہمارے اکابر کی ہیں۔

انبیا علیہم السلام کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مظلوم مخلوق کے لیے رحمت ہوتے ہیں۔ اور وہ اللہ کو اپنی ساری مخلوق سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی مخالفت بھی ہوتی ہے۔ ان کو پریشانیاں بھی آتی ہیں۔ اس لیے آج کے ظالمانہ نظام کی موجودگی میں انبیا کی اس سنت کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ایسا نظام قائم کیا جائے جو انسانیت کے لیے رحمت ہو۔ ہمارے دوستوں کو بڑی خوشی ہونی چاہیے کہ جس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاؑ کو مبعوث فرمایا، وہ کام ہم سے لیا جارہا ہے۔ ہمیں اس نظریے کو سیکھنے اور سکھانے کی توفیق نصیب ہورہی ہے۔ یہ بہت بڑی سعادت کی بات ہے۔ جتنا ہم یقین اور اعتماد کے ساتھ کام کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس راستے کی رُکاوٹوں کو دور فرمائیں گے۔

ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہم ہی تبدیلی لے کر آئیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ معاشرے میں عدل وانصاف غالب ہونا چاہیے۔ یہ کام کوئی بھی کرے تو مقصد حاصل ہوجائے گا۔ ظلم مٹ جائے۔ عدل قائم ہوجائے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: ''جو میری مردہ سنت کو زندہ کرے گا، اس کو 100 شہیدوں کا ثواب ملے گا۔'' تو انبیاؑ کا ہر کام سنت ہوتا ہے۔ اس لیے عدل وانصاف کو قائم کرنے کی سنت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کو قائم کرنے کے لیے کوشش کرنا بڑی سعادت کی بات ہے۔ اسی لیے رجعت پسند مذہبی جماعتیں عوام میں بدنام ہیں کہ موجودہ دور کے اس تقاضے کو پیش نظر نہیں رکھتیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ہمیں دین کے انقلابی نظریے پر پورا یقین ہو۔ اور اس کے مطابق ہم حکمت عملی اختیار کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اندر سے انفرادی سوچ ختم کرکے اجتماعی سوچ پیدا فرمائے۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ نوجوان کو اس انقلابی نظریے سے وابستہ کریں اور اس کو جو غلط فہمی ہے، اس کو دور کریں۔ دشمن ہمیشہ ایسی جماعت سے پریشان ہوتا ہے، جو کہ باشعور، تربیت یافتہ ہو۔ بکنے اور جھکنے والی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جیسے اس ملک کے عسکری ادارے میں سامراج مخالف سوچ پیدا کی ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ہماری بیوروکریسی میں بھی سامراج کی نفرت پیدا کردے تو یہ بھی ایک رُکاوٹ دور ہوجائے گی۔ اور اسی طرح آہستہ آہستہ سیاسی طاقتوں میں بھی سیاسی شعور کی تبدیلی آسکتی ہے۔ اس لیے ہم نے صبر کے ساتھ کام کرنا ہے۔ مخالفت سے ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ جتنی زیادہ مخالفت ہوگی، اتنا زیادہ کام بڑھے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں استقامت کے ساتھ اس کام کو کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

دینی مسائل

اس صفحہ پر قارئین کے سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔

از جناب مفتی عبدالغنی قاسمی شعبہ دارالافتاء ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

سوال (1) ایک شخص فجر کی دو سنتیں نہیں پڑھ سکا اور فجر کی جماعت میں شامل ہوگیا۔ کیا وہ فرض سے فارغ ہوکر طلوع آفتاب سے پہلے دو سنت کی قضا کرسکتا ہے یا نہیں؟ نبیل، سرگودھا

جواب: نماز فجر کی سنت رہ جائیں تو ان کو طلوع آفتاب کے بعد زوال تک پڑھ سکتا ہے۔ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے پڑھنا مکروہ ہے۔

سوال (2) مہر فاطمی کسے کہتے ہیں اور اس کی کتنی مقدار ہے؟ ساجد، لاہور

جواب: حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے عقدِ مسنون میں حضورؐ نے جو مہر مقرر فرمایا تھا۔ اسی مقدار میں جو مہر مقرر کیا جائے۔ اس کو مہر فاطمی کہتے ہیں۔ راجح قول کے مطابق مہر فاطمی ایک سو ساڑھے ستاون تولہ چاندی کے مساوی ہے۔ اور اکثر ازواجِ مطہرات کا مہر اسی مقدار میں مقرر رہا۔

سوال (3) شادی کے بعد عورت اگر اپنے والدین کے گھر جائے تو کیا قصر نماز پڑھے گی یا چار رکعت پوری پڑھے گی؟ فیض احمد، لاہور

جواب: شادی کے بعد اگر عورت مستقل طور پر اپنے سسرال کو وطن اصلی بنالے تو اب اس کا وطن اصلی سسرال ہی بن جائے گا۔ اور والدین کا گھر اگر شرعی مسافت (کم از کم 77 کلومیٹر) سے زیادہ پر ہے تو پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں قصر کرے گی۔

سوال (4) ایک شخص نے اپنے لڑکے کی منگنی ایک عورت سے کردی۔ لیکن وہ لڑکا نکاح سے پہلے فوت ہوگیا۔ تو کیا اب اس لڑکے کا والد اس عورت سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟ اسرارالدین، حسن ابدال

جواب: منگنی چوں کہ نکاح نہیں، بلکہ وعدۂ نکاح کا نام ہے۔ اس لیے لڑکے کا اس عورت سے نکاح نہ ہونے کی صورت میں اس لڑکے کا والد اس عورت سے شادی کرسکتا ہے۔ محض منگنی ہوجانے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔

سوال (5) عمر نے اپنے گھر سے کسی ایسے شہر کا سفر کیا جہاں جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ ساٹھ کلومیٹر ہے۔ یعنی شرعی مسافت سے کم ہے۔ جب کہ دوسرے راستے کی مسافت (80 کلومیٹر) ہے۔ جو شرعی مسافت سے زیادہ ہے اور عمر نے کسی وجہ سے طویل راستے سے سفر کیا تو کیا ایسی صورت میں وہ شرعی طور پر مسافر ہوگا یا نہیں؟ محمد آصف، لاہور

جواب: سفر میں جس راستے کو اختیار کیا جائے اسی کی مسافت کا اعتبار ہوگا۔ چناں چہ اگر عمر نے وہ راستہ اختیار کیا ہے۔ جو (77 کلومیٹر) سے زیادہ ہے تو مسافر ہوجائے گا۔ اگرچہ اس شہر میں جانے کے لیے دوسرا راستہ شرعی مسافت سے کم ہی کیوں نہ ہو۔

سوال (6) ایک شخص فوت ہوا۔ جس کے ورثا درج ذیل ہیں: والدہ، ایک بیٹا اور ایک بیوہ۔ متوفی کی وراثت کیسے تقسیم ہوگی؟ عبداللہ، جھنگ

جواب: متوفی کی کل جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کے کل چوبیس حصے کیے جائیں گے۔ جن میں سے چار حصے والدہ کو، تین حصے بیوہ کو اور سترہ حصص بیٹے کو ملیں گے۔ فقط

مدیر اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع وناشر نے
اے۔ جے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ، لاہور سے چھپوا کر
دفتر ماہنامہ ''رحیمیہ'' رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ، لاہور سے شائع کیا۔

www.rahimia.org